Faith and Discovery
July – Decembe 2026 Vol:4, Issue:2
ISSN(p): 3007-0643
ISSN(e): 3007-0651

علامہ اقبال کی نظموں میں تصورِ تقدیر اور انسانی اختیار: ایک فکری و فلسفیانہ مطالعہ

Destiny and Human Free Will in Iqbal's Poetry: An Intellectual and Philosophical Study

فوزیہ
شعبہ اُردو، دی امپیریل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور

Abstract

This research article critically examines the concept of destiny (*Taqdir*) in the poetry of Allama Muhammad Iqbal, focusing on its intellectual, philosophical, artistic, and sociocultural dimensions. It explores Iqbal's reinterpretation of destiny as a dynamic, creative, and evolutionary process rather than a predetermined and immutable force that restricts human freedom and initiative. Employing a descriptive and analytical approach, the study investigates the relationship between destiny, *Khudi* (selfhood), human free will, continuous action, love (*Ishq*), and collective consciousness within the broader framework of Iqbal's philosophical thought. Particular attention is devoted to the influence of Islamic teachings and Western philosophical traditions, especially the ideas of Henri Bergson concerning time, creativity, and the continuous evolution of life. Through a critical examination of Iqbal's major poems, including *Masjid-e-Qurtuba*, *Khizr-e-Rah*, *Saqi Nama*, *Jibreel-o-Iblees*, and *Iblees Ki Majlis-e-Shura*, the article highlights how symbolism, imagery, dramatic dialogue, metaphor, and

historical allusion communicate his conception of destiny as an active and transformative reality. The study further investigates the interconnectedness of individual and collective destiny, emphasizing the role of moral responsibility, spiritual awakening, intellectual freedom, and sustained struggle in shaping the future of individuals and nations. It also examines Iqbal's interpretation of history as a continuous process of civilizational transformation in which the rise and decline of nations are closely associated with their ethical values, intellectual consciousness, and collective actions. The analysis demonstrates that Iqbal challenges fatalistic interpretations of destiny by presenting human beings as morally responsible agents capable of shaping their individual and collective futures through purposeful action within the framework of divine sovereignty. Furthermore, his poetic symbolism transforms abstract philosophical concepts into vivid literary expressions, integrating aesthetic creativity with ethical and spiritual guidance. The article concludes that Iqbal's philosophy of destiny constitutes a comprehensive intellectual and moral framework that reconciles divine will with human freedom, individual self-realization with collective advancement, and historical consciousness with the continuous reconstruction of life. His vision remains relevant to contemporary discussions concerning human agency, social transformation, moral responsibility, and the intellectual regeneration of civilizations.

Keywords:

Allama Muhammad Iqbal, Concept of Destiny (*Taqdir*), Philosophy of Selfhood (*Khudi*), Human Free Will and Divine Sovereignty, Creative Evolution, Philosophy of Time, Love (*Ishq*) and Human Action, Symbolism and Poetic Imagery, Individual and Collective Destiny, Historical and Civilizational Consciousness

اقبال کی نظموں کے فکری پس منظر کو سمجھنے کے لیے یہ بات نہایت اہم ہے کہ ان کے ہاں تصورِ تقدیر محض ایک روایتی مذہبی عقیدہ نہیں بلکہ ایک فعال، عملی اور فکری نظریہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تقدیر انسان کی مجبوری یا بے بسی کا نام نہیں، بلکہ ایک ایسا نظامِ حیات ہے جس میں انسان کو عمل، ارادے اور خودی کے ذریعے اپنی زندگی سنوارنے اور بہتر بنانے کا موقع دیا گیا ہے۔ ان کے فکری پس منظر میں یہ بنیادی تصور نمایاں ہے کہ انسان اپنی مسلسل جدوجہد اور محنت کے ذریعے اپنی تقدیر پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس لیے اقبال کی نظموں میں تقدیر کا مفہوم جبر کے بجائے عمل اور تخلیق کے ساتھ جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ انسان کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ کائنات میں ترقی اور تبدیلی کا راز حرکت اور کوشش میں پوشیدہ ہے، اور جو قومیں یا افراد عمل کو ترک کر دیتے ہیں وہ زوال کا شکار ہو جاتے ہیں:

تقدیرِ اُمَم کیا ہے، کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

(اقبال،۲۰۱۸،ص ۱۴۷)

اقبال کی نظموں میں مغربی و اسلامی افکار کا اثر:

اقبال کے فکری پس منظر میں مغربی اور اسلامی دونوں افکار کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی فکری تشکیل میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفہ، سائنس اور جدید سیاسی نظریات نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

جب اقبال ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے تو وہاں انھوں نے جدید فلسفیانہ افکار، سائنسی نظریات اور سیاسی نظاموں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس علمی تجربے نے ان کی سوچ کو وسعت بخشی اور انھیں یہ شعور دیا کہ قوموں کی ترقی کا راز محض تقدیر پر بھروسہ کرنے میں نہیں بلکہ مسلسل عمل، محنت اور جدوجہد میں پوشیدہ ہے۔ یہی فکری تبدیلی بعد میں ان کی شاعری میں تصورِ تقدیر

کی نئی تعبیر کی صورت میں سامنے آئی، جہاں انھوں نے تقدیر کو جبر کے بجائے انسان کے عمل، ارادے اور خودی سے وابستہ ایک متحرک حقیقت کے طور پر پیش کیا:

"۱۹۰۵ء تک کی شاعری کو اقبال نے اپنی سخن وری کا دور اول قرار دیا ہے۔ اس کے بعد اقبال یورپ چلے گئے اور یورپ میں ان کے مطالعہ، مشاہدہ اور تفکر نے ان کی طبعیت کا رنگ بھی بدل دیا۔" (حمید، ۲۰۱۴، ص ۱۱)

اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی کا ایک اہم سبب تقدیر کے بارے میں غلط اور محدود تصور تھا۔ ان کے خیال میں بہت سے مسلمان تقدیر کو ایک ایسی طاقت سمجھ بیٹھے تھے جو انسان کو بے بس اور بے عمل بنا دیتی ہے، جس کے نتیجے میں ان میں مایوسی اور جمود پیدا ہو گیا تھا۔

اقبال نے اس فکری غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اپنی نظموں میں بار بار یہ پیغام دیا کہ تقدیر کا اصل مفہوم بے عملی اور تسلیم و رضا نہیں، بلکہ اپنی صلاحیتوں کو پہچان کر انھیں بروئے کار لانا ہے۔ ان کے مطابق انسان کا فرض ہے کہ وہ مسلسل جدوجہد کرے، اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرے اور اپنی خودی کو بیدار رکھے، کیونکہ حقیقی تقدیر وہی ہے جو انسان اپنے عمل اور ارادے کے ذریعے خود تشکیل دیتا ہے:

مانندِ سحَر صحنِ گُلستاں میں قدم رکھ
آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹُوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش، و لیکن
ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھُوٹے!

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۶۳۱)

اقبال انسان کو اعتدال، احتیاط اور بلند مقصدیت کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں اور مضبوط خودی کو تقدیر سازی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مشکلات کا سامنا اور مسلسل جدوجہد خودی کی پختگی کی علامت ہے، جو انسان کو باعمل اور باحوصلہ شخصیت بناتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں علامت نگاری محض فنی حسن نہیں بلکہ ایک فکری اور عملی پیغام

ہے، جس کے ذریعے وہ قاری کو واضح رہنمائی اور فکری بیداری فراہم کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے وہاب اشرفی کے مطابق اقبال کے ہاں علامت اور فکر ایک دوسرے سے گہرا ربط رکھتے ہیں اور ایک ہی مقصد کی تکمیل کرتے ہیں:

> ''دراصل اقبال کی شاعری کے لفظی ڈھانچے میں استعارے یا علامتی استعارے اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ ہم ایسے استعارے یا علامتی استعارے پر مبنی نظموں کو علامتی کہہ دیتے ہیں۔ حالاں کہ علامت پسندی اور چیز ہے اور علامت نگاری اور علامہ اقبال علامت پسند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ بعض مخصوص ذاتی علائم کے استعمال کے باوجود سریت اور ابہام سے کوسوں دور ہے۔''(نارنگ، ۲۰۱۰، ص۲۹۵)

تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اقبال کے ہاں تصورِ تقدیر محض ایک فلسفیانہ بحث نہیں بلکہ ایک عملی اور اخلاقی نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی علامت نگاری اسی فکری حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ انسان کو زندگی کے ہر مرحلے میں شعور ذمہ داری اور بلند حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ اس تناظر میں اقبال کے ہاں تصورِ تقدیر اور فکری علامت نگاری کا باہمی تعلق نہایت گہرا ہے کیونکہ وہ علامت کے ذریعے یہ پیغام دیتے ہیں کہ تقدیر کوئی جامد یا ناقابل تغیر حقیقت نہیں، بلکہ ایک متحرک اور قابل تعمیر نظام ہے جسے انسان اپنی بیداری شعور اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے بہتر بنا سکتا ہے۔ یوں اقبال کے فکری نظام میں علامت نگاری اور تصورِ تقدیر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو کر انسان کو ایک فعال باشعور اور خود مختار زندگی کی طرف رہنمائی فراہم کرتے ہیں:

> ''اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔'' (احمد، ۲۰۰۱، ص۱۸۷)

اسی طرح اقبال کے فکری پس منظر کی بنیاد علم، شعور تجربہ پر ہے۔ ان کی شاعری میں سائنی عقل اور فکری ارتقا کو تقدیر بدلنے کی عاقت سمجھا گیا ہے:

مَیں نے ناداروں کو سِکھلایا سبق تقدیر کا
مَیں نے مُنعِم کو دیا سرمایہ داری کا جُنوں

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص ۷۰۲)

فکری پس منظر میں یہ بات نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ وہ انسانی تاریخ اور فکر کو محض ماضی کے واقعات کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک ایسا تجربہ قرار دیتے ہیں جس سے انسان رہنمائی حاصل کر کے اپنے مستقبل کی سمت متعین کر سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک فرد اور قوم کی ترقی کا انحصار علم شعور اور فکری بیداری پر ہے۔ ان کے تصور میں انسان اپنی تقدیر کو اسی وقت بہتر بنا سکتا ہے جب وہ علم کو اختیار کرے اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور شعوری طور پر اپنی زندگی کے فیصلے کرے۔ اس طرح اقبال کے فکری نظام میں تاریخ، علم اور شعور انسان کی تقدیر سازی کے بنیادی عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادب میں فنی پس منظر سے مراد وہ لسانی، اسلوبیاتی اور فنی عوامل ہیں جن کی بنیاد پر کسی شاعر کا کلام تشکیل پاتا ہے۔ شاعری محض خیالات کے اظہار کا نام نہیں بلکہ جذبات، تجربات اور افکار کو موزوں اور مؤثر الفاظ کے ذریعے ایک جمالیاتی پیکر میں ڈھالنے کا فن ہے۔ جب شاعر کسی خیال کو شعری قالب میں پیش کرتا ہے تو وہ صرف معنی ہی نہیں بلکہ لفظوں کی ترتیب، صوتی آہنگ، تشبیہات، استعارات اور علامتی اندازِ بیان کے ذریعے اس میں تاثیر اور دلکشی پیدا کرتا ہے۔

فنی اعتبار سے شعر کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اسی امر پر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے خیال کو کس حد تک مؤثر، بامعنی اور خوبصورت زبان میں پیش کر سکا ہے۔ اسی عمل میں شاعر کو مسلسل محنت، ریاضت اور فنی مہارت درکار ہوتی ہے، جسے اقبال نے "خونِ جگر" صرف کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں کسی بھی شاعر کا فنی شعور اور اسلوبیاتی انفرادیت سامنے آتی ہے۔

اقبال نے اردو اور فارسی شاعری میں کلام کو محض ادبی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری اور اصلاحی پیغام کا ذریعہ بنایا۔ وہ اپنی شاعری کو ایک فکری مشن سمجھتے تھے اور اسے اشاروں، کنایوں اور علامتی انداز میں پیش کرتے تھے تاکہ اس کی معنویت گہری اور وسیع ہو جائے۔ ان کے نزدیک فنی حسن اور شعری دلکشی کے بغیر پیغام مؤثر نہیں ہو سکتا، اس لیے انھوں نے تشبیہ، استعارہ اور علامت جیسے شعری وسائل کو نہایت مہارت سے استعمال کیا۔ اقبال کے مطابق حقیقی شاعری محض خیال نہیں بلکہ مسلسل محنت اور فنی ریاضت کا نتیجہ ہے، جسے وہ "خونِ جگر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں فنی حسن اور فکری گہرائی اس قدر مربوط ہیں کہ ان کے کلام کو نہ صرف فلسفہ کہا جا سکتا ہے نہ محض شاعری، بلکہ یہ ایک ایسا فکری و جمالیاتی امتزاج ہے جو ذہن اور دل دونوں کو متاثر کرتا ہے۔

نظم خضر راہ کا پہلا بند ساکن تصویر کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے، جہاں فطرت کے مناظر کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ایک مکمل اور واضح منظر قاری کے ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس سے اقبال کے فنی شعور اور پیکر تراشی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح الفاظ کے ذریعے ایک جاندار اور مؤثر تصویر تخلیق کرتے ہیں:

ساحلِ دریا پہ مَیں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھُپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکُوت افزا، ہَوا آسودہ، دریا نرم سَیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شِیر خوار
موجِ مُضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضَو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۲۸۳)

اقبال کی نظم شعاعِ امید اس اعتبار سے ایک نمایاں مثال ہے، جس میں تقدیر کے تصور کو فنی اور تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں چاند اور تاروں کو امید اور حقیقت کی علامت بنایا گیا ہے، جبکہ سورج کی کرنیں انسان کی کوشش، آرزو اور تقدیر سے کشمکش کی نمائندگی کرتی ہیں:

سُورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ اُفُق سے لے کر لالے کے پھُول مارے
پہنا دیا شفَق نے سونے کا سارا زیور
قُدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اُتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظُلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۲۰۱)

اقبال کی شاعری کے فنی مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری اکثر ڈرامائی کیفیت اختیار کر لیتی ہے، اور اقبال کی عظیم نظمیں اس ڈرامائیت کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ ان نظموں میں واقعات، کردار اور مکالمے اس انداز سے پیش کیے گئے ہیں کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تقدیر کے فیصلے اور انسانی جدوجہد کا ایک جیتا جاگتا منظر اس کے سامنے اسٹیج پر جاری ہو۔ فنی اعتبار سے اقبال نے تقدیر کے تصور کو محض ایک نظری بحث کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اسے ڈرامائی مکالموں اور کرداروں کے ذریعے عملی اور متحرک صورت میں دکھایا ہے۔ ان کی نظموں میں مختلف کردار تقدیر، اختیار اور عمل کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جس سے تقدیر کا تصور ایک زندہ تجربہ بن جاتا ہے:

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ اِبلیسی نظام
پُختہ تر اس سے ہوئے خُوئے غلامی میں عوام

ہے اَزل سے ان غریبوں کے مقدّر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۷۰۲)

مثال کے طور پر نظم جبریل و ابلیس میں جبریل اور ابلیس کے درمیان مکالمہ دراصل خیر و شر اور تقدیر و اختیار کی کشمکش کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ہنگامی اجلاس جاری ہو، جہاں انسانیت کی تقدیر کے خلاف سازشیں تیار کی جارہی ہوں اور قاری اس پوری کارروائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو:

جو دُونی فطرت سے نہیں لائقِ پرواز
اُس مُرغِکِ بیچارہ کا انجام ہے اُفتاد
ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا
ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیّاد
اُس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادی افکار ہے اِبلیس کی ایجاد

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۴۹۸)

نظموں میں تاریخی واقعات اور سیاسی تبدیلیوں کو بھی تقدیر کے وسیع تر نظام سے جوڑ کر پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں بڑے انقلابات اور سلطنتوں کا عروج و زوال محض حادثات نہیں بلکہ تقدیر کے تحت جاری ایک مسلسل عمل کی علامت ہیں۔ فنی اور فکری اعتبار سے اقبال نے Russian Revolution کو ایک "نئے سورج" سے تعبیر کیا ہے، جو اس بات کی علامت

ہے کہ تاریخ میں جب کوئی بڑی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو وہ تقدیر کے ایک نئے باب کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے مٹ جانے کو انھوں نے ستاروں کے غروب ہونے سے تشبیہ دی ہے، جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ قوموں اور ریاستوں کی تقدیر بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور کوئی طاقت ہمیشہ قائم نہیں رہتی:

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہُوا
آسماں! ڈُوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

(اقبال،۲۰۱۸ء، ص۲۹۲)

اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ماں کی یاد کو ایک نہایت لطیف اور بامعنی فنی استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس کے ذریعے تقدیر اور روحانی وابستگی کے تصور کو اجاگر کیا جاتا ہے:

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دُعاؤں سے فضا معمور ہے

(اقبال،۲۰۱۸ء، ص۲۶۵)

فنی پس منظر میں اقبال ماں کی دعاؤں کو کعبے کی مقدس دعاؤں سے تشبیہ دے کر یہ واضح کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی اور تقدیر میں روحانی اثرات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مختلف ادبی صنعتوں، خصوصاً تلمیح کا نمایاں استعمال ملتا ہے، جو محض فنی آرائش نہیں بلکہ ایک فکری حکمتِ عملی ہے۔ اقبال تلمیحی اشاروں کے ذریعے تاریخی اور مذہبی واقعات کو اپنے کلام میں سمو کر یہ حقیقت اجاگر کرتے ہیں کہ انسانی اور قومی تقدیر اتفاقی نہیں بلکہ شعور، عمل اور روحانی و تاریخی تسلسل کے نتیجے میں تشکیل پاتی ہے۔

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرُود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصُود ہے!

(اقبال،۲۰۱۸ء، ص۲۸۵)

بڑے شاعر اپنے افکار و نظریات کی ترسیل کے لیے علامتوں (Symbols) کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ علامتیں مجرد خیالات کو محسوس اور بامعنی صورت میں پیش کرنے کا مؤثر ذریعہ بنتی ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں علامتی اسلوب کو خاص طور پر اپنے تصورِ تقدیر کی وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں مختلف علامتیں تقدیر کے متحرک اور ارتقائی تصور کو اجاگر کرتی ہیں۔ مثلاً ابلیس کا کردار بعض مقامات پر مسلسل جدوجہد، فکری بغاوت اور حرکت کی علامت بن جاتا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تقدیر جامد نہیں بلکہ کشمکش اور عمل کے ذریعے تشکیل پاتی ہے۔ اسی طرح شاہین خودی، بلند نظری اور مسلسل جستجو کی علامت ہے، جو انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ اپنی تقدیر کی بلندی کا انحصار اس کے عمل اور حوصلے پر ہے:

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خُونِ شفَق میں ڈُوب کر نکلے
ہُوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گُہر نکلے
غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اِکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رُسوا ہُوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نُوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈُوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈُوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوّت ہے جو صورت گرِ تقدیر ملّت ہے

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۳۰۳)

نظم "مسجد قرطبہ"، "خضر راہ"، "ساقی نامہ" میں تقدیر کا تصور:

اقبال کی نظم مسجد قرطبہ دراصل ان کے فکری ارتقاء کا وہ مرحلہ ہے جہاں زمان، تقدیر اور انسانی خودی کا باہمی رشتہ ایک واضح نظری صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ نظم ۱۹۳۳ء میں اس وقت تخلیق ہوئی جب محمد اقبال یورپ کے سفر سے واپس آ رہے تھے اور مغربی مفکرین کے نظریات کا براہِ راست مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس سفر کے دوران پیرس میں ان کی ملاقات مشہور فرانسیسی فلسفی برگساں سے ہوئی، جس نے اقبال کے ذہن میں زمان اور تقدیر کے مسئلے کو مزید گہرائی کے ساتھ اجاگر کیا:

> "اسرار خودی کی تصنیف کے وقت سے اقبال کا مفکرانہ ذہن زمان و مکان کے پیچیدہ مسئلے سے دوچار تھا۔ زمان و مکان کی بحث الٰہیات کی نئی بحث نہیں۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں آئن سٹائن اور برگساں نے اس کو جو نئی جہت دیدی اس کا اقبال کے ذہن پر گہرا اثر پڑا تھا۔" (نارنگ،۲۰۱۰،ص۵۶-۵۷)

ظم مسجد قرطبہ میں اقبال نے تقدیر کو ایک تخلیقی اور متحرک حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے، جس میں زمان، ارادہ اور عمل تینوں باہم مربوط عناصر ہیں۔ اس نظم کے ذریعے اقبال یہ پیغام دیتے ہیں کہ تقدیر کوئی مقدر شدہ جبر نہیں بلکہ ایک ایسا امکان ہے جسے انسان اپنی خودی اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے حقیقت میں بدل سکتا ہے:

دریا بہ وجود خویش موجے دارد!

(نارنگ،۲۰۱۰،ص۵۷)

اقبال نے زمان و تقدیر کے افکار پر غور کرتے ہوئے فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں سے ملاقات کی، جہاں انھوں نے اسلامی تصورِ تقدیر کو اعتماد کے ساتھ پیش کیا اور اس یقین کو مزید مضبوط کیا کہ تقدیر اندھی قوت نہیں بلکہ ایک بامعنی اور تخلیقی عمل ہے جس میں انسانی ارادہ اور جدوجہد بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ بعد ازاں اسپین، خصوصاً اندلس کی سرزمین، اقبال کے لیے ملتِ اسلامیہ کے عروج و زوال کی ایک زندہ علامت بن گئی، جس نے انھیں یہ شعور دیا کہ قوموں کی تقدیر ان کے ایمان، عمل اور اجتماعی ارادے سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسی لیے اقبال نے اندلس کی تاریخ کو اسلامی تہذیب کی تخلیقی قوت اور تقدیر سازی کی علامت کے طور پر دیکھا۔

ان کی مشہور نظم مسجد قرطبہ اسی فکری پس منظر کی نمائندہ ہے، جس میں وہ اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ زماں کی گردش کے باوجود وہی قومیں باقی رہتی ہیں جو اپنی خودی کو بیدار کر کے اپنی تقدیر کو خود تشکیل دیتی ہیں:

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند سحر پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۴۳۰)

ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ بھی لکھی۔ الحمراء کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا، جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔" (نارنگ، ۲۰۱۰، ص ۵۸)

اقبال کی نظم مسجد قرطبہ ان کے فلسفۂ زمان اور تصورِ تقدیر کا جامع شعری اظہار ہے، جس میں وہ زمان، ارادہ اور تقدیر کو ایک متحرک اور تخلیقی حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اقبال نے فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں کے فلسفۂ حیات کا گہرا مطالعہ کیا، جس کے تحت زندگی کو ایک مسلسل بہاؤ (سیلانِ حیات) سمجھا جاتا ہے، تاہم اقبال نے اس میں مقصدیت اور اخلاقی شعور کا اضافہ کیا۔ ان کے نزدیک تقدیر کوئی جامد یا اندھا نظام نہیں بلکہ ایک ارتقائی عمل ہے جو انسان کے شعور، ارادے اور مسلسل عمل سے تشکیل پاتا ہے، اور یہی فکر ان کی شاعری میں مسجد قرطبہ کے فکری پس منظر کے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ اس طرح نظم مسجد قرطبہ میں اقبال نے تقدیر کو ایک متوازن تصور کے طور پر پیش کیا ہے، جس میں نہ تو جبر کی سختی ہے اور نہ ہی بے مقصد آزادی کی بے سمتی؛ بلکہ یہ ایک ایسا تخلیقی نظام ہے جس میں مقصدیت، ارادہ اور امکانات تینوں باہم مربوط رہتے ہیں۔ یہی توازن اقبال کی شاعری کو فلسفیانہ گہرائی عطا کرتا ہے اور ان کے تصورِ تقدیر کو ایک فعال اور تعمیری قوت کے طور پر نمایاں کرتا ہے، اقبال کہتے ہیں:

> ”میں اس حد تک برگساں سے متفق ہوں کہ اگر مقصدیت کے یہ معنی ہیں کہ مستقبل کی ایک معین اور مشخص صورت جسے معرض وجود میں لانے کی کوشش مقصود حیات ہے تو زماں بے حقیقت ہو جاتا ہے کیوں کہ اس میں اخلاقی باقی نہیں رہتی۔“ (نارنگ، ۲۰۱۰، ص۵۸)

اقبال کے مطابق مسجد قرطبہ کے اشعار میں زمان کو تقدیر کی بنیادی قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو کائنات، انسان اور قوموں کے عروج و زوال کو مسلسل متحرک رکھتا ہے۔ سلسلۂ روز و شب کو ایک تخلیقی اور ارتقائی عمل کے طور پر دکھایا گیا ہے جس میں تقدیر جامد فیصلہ نہیں بلکہ مسلسل بدلتی ہوئی حقیقت ہے۔ ان اشعار میں تقدیر کو ایک امتحان اور جدوجہد کے میدان کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جہاں انسانی عمل اور کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک زندگی کی بقا یا فنا خارجی جبر کے بجائے انسان کے اپنے اعمال پر منحصر ہے، اس لیے یہ تصور مایوسی کے بجائے بیداری، خود احتسابی اور مسلسل جدوجہد کی دعوت دیتا ہے۔

نظم مسجد قرطبہ میں تصورِ تقدیر کو مثبت اور ارتقائی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق زمان اگرچہ ایک طاقتور اور مسلسل تغیر پذیر حقیقت ہے، لیکن عشق اور ایمان پر مبنی عمل

اسے معنی اور سمت عطا کرتا ہے، جس سے انسان فنا کے بجائے بقا حاصل کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تقدیر کا اصل محرک زمان نہیں بلکہ عشق ہے، کیونکہ عشق سے وابستہ عمل انسان کو دوام بخشتا ہے۔ اسی لیے وہ مردِ خدا کے عمل کو ابدیت کی علامت قرار دیتے ہیں اور یہ واضح کرتے ہیں کہ حقیقی تقدیر عشق، ایمان اور مسلسل جدوجہد سے تشکیل پاتی ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تُند و سبک سَیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سَیل ہے، سَیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِرواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رُسول، عشق خدا کا کلام

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۴۲۰)

نظم مسجد قرطبہ میں سطوتِ زمان، نقشِ مردِ خدا اور عشق کا باہمی تعلق بظاہر غیر مربوط محسوس ہوتا ہے، لیکن اقبال کے تصورِ عشق اور تصورِ تقدیر سے واقف قارئین اس ربطِ پنہانی اور اس کی رمزیت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک زماں کائنات کی حرکت اور تغیر کی علامت ہے، جبکہ مردِ خدا اس حرکت کو بامقصد بنانے والی قوت ہے، اور عشق وہ بنیادی محرک ہے جو اس تمام عمل کو سمت اور معنویت عطا کرتا ہے۔ اس طرح ان تینوں عناصر کا امتزاج اقبال کے تصورِ تقدیر کی جامع تعبیر پیش کرتا ہے، جس میں زمان، عمل اور عشق ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ باہم مربوط حقیقتیں ہیں:

"تمام کائنات اس لیے مائل بہ ارتقا ہے کہ وہ خدا کی طرف عود کرنا چاہتی ہے۔ اس تنزلاتی اور تدریجی نظام میں وہ جذبہ جو عالم کے اجزاء میں اتحاد پیدا کرتا ہے۔ لیکن محض اتحاد اجزاء اور نظم عالم، غایت حیات و کائنات نہیں، ہر ذرّے کا مقصود عروج وصعود الی اللہ ہے..... عشق کی بدولت ہستی کا ہر ذرہ وسیع ترین اتحاد پیدا کرنے اور اوپر کی طرف ترقی کرنے پر مائل ہے۔" (نارنگ، ۲۰۱۰)

نظم مسجد قرطبہ میں سیلِ زمان، مردِ خدا اور سیلِ عشق جیسے تجریدی تصورات، ایک تاریخی اور محسوس حقیقت کے مشاہدے سے عملی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مسجد قرطبہ کو دیکھ کر اقبال اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگرچہ زمان ایک طاقتور سیلاب ہے، لیکن مردِ خدا کا عشق اس کے مقابل استقامت اور بقا کی علامت ہے، جو ان کے تصورِ تقدیر کی بنیاد بنتی ہے۔ اسی لمحے اقبال کو اپنی تہذیبی شناخت اور روحانی ورثے کا شعور شدت سے محسوس ہوتا ہے، جس سے ایمان اور عشق تقدیر سازی کی بنیادی قوتوں کے طور پر ابھرتے ہیں۔ اس طرح ان کے نزدیک خودشناسی اور روحانی بیداری انسان کو زمان کی بے ثباتی کے باوجود دوام اور معنوی بقاعطا کرتی ہے:

بر ہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است

(نارنگ، ۲۰۱۰، ص ۶۲)

نظم کے چوتھے بند میں اقبال کی نظر فکری دھندلکوں سے باہر نکل کر ایک واضح اور بیانیہ زاویے کی جانب مائل ہوتی ہے۔ وہ مسجد قرطبہ میں جلال و جمال کے ایسے مظاہر دیکھتے ہیں جو ان کے تصورِ تقدیر میں انسانی عمل اور تاریخی ارتقاء کی علامت بنتے ہیں۔

نصف حصے سے اقبال کی توجہ تاریخِ اندلس کے اس دور کی طرف مڑ جاتی ہے، جس کے زمانے اور حالات نہایت پیچیدہ اور متنوع تھے اور یورپ میں نشأتِ نشاۃ الثانیہ کا سبب بنے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ مرحلہ اقبال کے تصورِ تقدیر میں تاریخی اور تمدنی تناظر کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ تقدیر محض شخصی یا روحانی عمل تک محدود نہیں بلکہ ایک تاریخی اور

تمدنی تسلسل کے ذریعے بھی انسان کی جدوجہد اور عمل کی دائمی معنویت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح اقبال کی نظم میں، تقدیر کا تصور مجرد فلسفیانہ خیال سے عملی اور تاریخی حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مسجد قرطبہ ایک زندہ مثال ہے جہاں عشق، ایمان، اور انسانی عمل نے زمان کی بے ثباتی کے باوجود دوام اور بقا پیدا کی۔ تاریخی اور جمالیاتی مظاہر، ستون، منار، اور صوتی تجربات اقبال کے لیے اس حقیقت کے متحرک علامات ہیں کہ تقدیر کی تشکیل میں انسان کا کردار اور روحانی وابستگی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں:

مِٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
س کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ
اس کی زمیں بے حدود، اس کا اُفُق بے ثُغور
اس کے سمندر کی موج، دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہدِ کُہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۴۲۳)

تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بند نظم کا فکری محور اور شعری واردات دونوں ہے۔ مردِ مسلم کی روحانی اور عملی قوت مسجد قرطبہ کے تاریخی اور جمالیاتی مظاہر کے مقابلے میں ایک نمایاں مقام حاصل کرتی ہے۔ یہ تصور یہ واضح کرتا ہے کہ تقدیر انسانی اعمال، ایمان اور عشقِ الٰہی کے ذریعے متعین ہوتی ہے، اور مردِ مومن کی مستقل جدوجہد، عمل و یقین تقدیر کے ارتقائی سلسلے میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کے کلام میں مردِ مومن کی خصوصیات پاک دلی، نیک نیتی، محدود توقعات اور عظیم مقاصد اس بات کی علامت ہیں کہ حقیقی تقدیر محض زمان کی گردش یا قدرتی حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ انسان کی روحانی وابستگی اور اخلاقی کردار کا حاصل ہے:

تجھ سے ہُوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقامِ بلند، اس کا خیالِ عظیم
اس کا سُرور اس کا شوق، اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکُشا، کارساز
نُقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۴۲۳)

قرطبہ میں اقبال نے بندۂ مومن کے مقام کو عروجِ انسانیت اور تقدیر کے روحانی محور کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ مردِ مسلم کو صرف ایک تاریخی یا فوجی شخصیت نہیں بلکہ وہ فعال اور متحرک عنصر قرار دیتے ہیں جس کے اعمال، ایمان اور روحانی وابستگی تقدیر کی سمت کو روشن کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ مقام اتنا بلند ہے کہ ستارے بھی اس کے حضور لرزہ بر اندام ہیں، اور انسانی انا اور خودی کا مظہر بن کر وہ صرف شخصی نہیں بلکہ کائناتی اور روحانی سطح پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ مردِ مسلم کے اس اعلیٰ مرتبے کو اقبال نے "اللہ کا ہاتھ" (یداللہ) اور "مولا صفات" کے الفاظ کے ذریعے بیان کیا ہے، جو تقدیر میں انسان کی فعال شرکت اور خدا کی رضا کے حصول کی علامت ہیں۔ اس طرح مردِ مسلم کی روحانی اور اخلاقی قوت، اس کے اعمال اور محبتِ الٰہی کا امتزاج، تقدیر کے ارتقائی سلسلے میں ایک نمایاں اور لازوال کردار ادا کرتی ہے:

"وہ اپنے دیدہ تصور سے ان عربی شہسواروں کا تصور کرتا ہے جنھوں نے طارق کی قیادت میں سفینہ سوخت بن کر یہ کہتے ہوئے ساحل اندلس پر قدم رکھا تھا کہ وہ حاملِ خُلق عظیم تھے۔ صاحب صدق ویقین تھے اور انھوں نے ایک شان دردیشی کے ساتھ شاہی کی تھی۔"(نارنگ، ۲۰۱۰، ص۶۴)

نظم مسجد قرطبہ میں اقبال نے یورپ کی تاریخی اور فکری تحریکوں کو تصورِ تقدیر کے وسیع فکری میں پیش کیا ہے۔ ان کے شعری تخیل میں یورپ کے صدیوں پر محیط ارتقائی عمل، اصلاح دین، انقلاب فرانس، اور دیگر سماجی و سیاسی تغیرات صرف تاریخی حقائق نہیں بلکہ ایک روحانی اور اخلاقی سلسلے کی علامت ہیں، جو انسانی اعمال، فکر اور عشقِ الٰہی کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تقدیر کسی بے مقصد یا محض قدرتی قوت کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک تخلیقی اور ارتقائی عمل ہے جس میں انسان کی ذمہ داری، ارادہ اور اخلاقی بصیرت مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کی نگاہ میں اسلامی انقلاب، جو ابھی بحرِ تاریخ کے تہ میں چھپا ہوا ہے، وقت کی گردش اور انسانی اعمال کے پردوں سے نمودار ہونا ہے۔ یہ انقلاب انسانی شعور، اخلاقی جدوجہد اور روحانی بصیرت کی نتیجہ خیزی کا مظہر ہے، اور اسی تناظر میں مردِ مسلم، مردِ مومن یا بندۂ مومن تقدیر کے ارتقائی عمل میں ایک فعال کردار ادا کرتا ہے۔ تاریخی اور ثقافتی مظاہر، جیسے یورپ کی اصلاحی تحریکیں اور تجدیدی شعور، اقبال کے کلام میں تقدیر کے روحانی اور عملی پہلو کو واضح کرتی ہیں، اور یہ دکھاتی ہیں کہ انسانی اعمال اور فکری بصیرت تقدیر کی تخلیق میں بنیادی عناصر ہیں:

دیکھ چُکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کُہن کے نشاں
دیکھیے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گُنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا!

(اقبال،۲۰۱۸ء، ص۴۲۶)

نظم مسجد قرطبہ میں اقبال نے آخری اسلامی انقلاب کے تصور کو تقدیر کے ارتقائی عمل کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کے کلام میں یہ انقلاب کسی محض اتفاق یا قدرتی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک روحانی اور اخلاقی سلسلے کی تکمیل ہے، جو انسانی اعمال، فکری بصیرت، اور عشقِ الٰہی کے اثرات سے تشکیل پاتا ہے۔ اقبال نے اس انقلاب کے پس منظر کو نہایت باریک بینی سے تاریخی، سماجی اور جمالیاتی عناصر کے امتزاج کے ذریعے تیار کیا ہے۔ شام کے آفتاب، لعل و بدخشاں کے

ڈھیر، اور سادہ و پر سوز گیت، سب اس ارتقائی عمل کے منظر نامے میں انسان اور کائنات کے درمیان تعلق کو واضح کرتے ہیں۔ اقبال کے تخیل میں یہ منظر تاریخی اور جمالیاتی حقیقت کے ساتھ تقدیر کے فلسفیانہ تناظر کو بھی پیش کرتا ہے۔ اقبال کے کلام میں فرنگی طاقت اس انقلاب کی تاب نہیں لاسکتی، کیونکہ تقدیر کے ارتقائی عمل میں انسان کی اخلاقی اور فکری شرکت لازمی ہے، اور یہ انقلاب اس قوم کے اعمال، بصیرت اور عشقِ الٰہی کا مرہون منت ہے:

عالمِ نَو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحَر بے حجاب
پردہ اُٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۴۲۷)

اسی تسلسل میں اقبال کی نظم خضر راہ اپنے فنی اور فکری حسن کے ساتھ ہم عصری مسائل کی ترجمانی کرتی ہے، جو پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلم دنیا کی سیاسی و تہذیبی صورتحال کا عکس ہے۔ اس نظم میں شاعر اور خضر کے مکالمے کے ذریعے زندگی، تاریخ اور اجتماعی تقدیر کے سوالات کو اجاگر کیا گیا ہے، جہاں خضر کی جوابی گفتگو فکری رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اقبال کے ہاں یہ نظم بھی اس تصور کو مضبوط کرتی ہے کہ انسانی اور قومی تقدیر کا دار و مدار شعور، عمل اور فکری بیداری پر ہے، اور یہی عناصر اسے ارتقائی اور تخلیقی حقیقت بناتے ہیں:

شب سکوت افزا، ھوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۲۸۳)

اس مسحور کن فضا کے مقابلے کے میں، جس کی تخلیق میں الفاظ کی باریک بینی سے ترتیب دی گئی صنعت کاری اہم کردار ادا کرتی ہے، قاری کو خضر کے کردار سے ایک احساس حیرت کے ساتھ متعارف کروایا جاتا ہے، جس کا آغاز یوں کیا گیا ہے:

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضَر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحَر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے، اے جویائے اسرارِ ازل!
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب
دل میں یہ سُن کر بَپا ہنگامۂ محشر ہُوا
مَیں شہیدِ جُستجو تھا، یوں سخن گستر ہُوا

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۲۸۴)

اقبال کے مطابق زندگی ایک مسلسل حرکت اور جستجو کا نام ہے، جسے کسی ایک لمحے یا نقطے تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے کلام میں صبح کے ستارے، غروبِ آفتاب، صحرا اور کاروان جیسے مناظر انسان کی تلاش، جستجو اور آزادی کی علامت بنتے ہیں۔ یہ تمام علامتیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ انسان کا حقیقی جوہر مسلسل سفر، تجربے اور نئی منزلوں کی تلاش میں پوشیدہ ہے، جبکہ جمود اور پابندی اس کی فطرت کے خلاف ہیں۔ اقبال کے نزدیک زندگی ایک زندہ، نامیاتی اور مسلسل تجدید پذیر حقیقت ہے جو ہر لمحہ نئی صورت اختیار کرتی ہے۔ یہ نہ محض اندازوں اور قیاسات سے سمجھی جا سکتی ہے اور نہ ہی نفع و نقصان کے محدود حساب سے اس کی حقیقت کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ زندگی دراصل ایک مسلسل بہاؤ (Continuum) اور خود تجدید (Self-Renewal) کا عمل ہے، جو اسے ہر دم متحرک اور تازہ رکھتا ہے، اور یہی تصور ان کی پوری شاعری میں بنیادی فکری بنیاد فراہم کرتا ہے:

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۲۸۷)

انسان کو ایک ارتقاء پذیر اکائی (Self-Evolving Unit) کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے، جس کی زندگی کا حقیقی مفہوم اپنے وجود کی تکمیل اور خود شناسی (Self-Realization) کے مسلسل عمل میں پوشیدہ ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو عدم

سے وجود کی طرف انسان کا سفر الوہی ارادے یعنی "کن فیکون" کے ظہور سے وابستہ ہے، جو تخلیق کے بنیادی اصول کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف ابتدائی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے لامتناہی بھی ہے، کیونکہ زندگی کی فطرت مسلسل تغیر اور تجدید کا تقاضا کرتی ہے:

> "انسان ایک ارتقاء پزیر اکائی (Self-Evolving unit) ہے اور دراصل اپنے آپ کو پانے (Self-realization) کا عمل ہی زندگی کے ہم معنی ہے۔ عدم سے وجود کی طرف انسان کا پہلا "قدم کن فیکون" کے آلوہی کلمے کے ادا کیے جانے پر منحصر تھا۔ یہ عمل بنیادی بھی ہے اور نامتناہی بھی، اور خود زندگی کی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسان کا امتیاز اس میں ہے کہ وہ برابر زندگی کی بہتر سے بہتر تشکیل نو میں مصروف رہے۔ اس تشکیل نو کے عمل کے دوران میں دوسروں سے فیضان کی بھیک طلب کرنا انسانی خودی کے منافی ہے۔" (انصاری، ۱۹۷۷، ص ۷۵)

انسان کی انفرادیت اور امتیاز اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ اپنی زندگی کی مسلسل بہتر تشکیل اور تنظیم میں مصروف رہے۔ اس تشکیلِ نو کے عمل میں دوسروں سے محض فیضان یا سہارا طلب کرنا انسانی خودی کے تصور کے منافی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اقبال کے نزدیک خودی کی مضبوطی کا دارومدار فرد کے اپنے باطنی وسائل کی تنظیم اور ان کے مؤثر استعمال پر ہے۔ مزید برآں، اس ارتقائی سفر میں خارجی کائنات کی رکاوٹوں پر قابو پانا بھی ناگزیر ہے، تاکہ انسان اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لا سکے۔

بانگ درا کی ابتدائی نظموں میں ایک نہایت خوبصورت اور معنی خیز نظم "کوششِ ناتمام" کے عنوان سے ملتی ہے، جس میں شاعر نے کائناتِ فطرت کے مختلف مظاہر کو علامتی انداز میں پیش کرتے ہوئے زندگی کی حقیقت اور اس کے بنیادی اصول کو واضح کیا ہے۔ اس نظم

کے اشعار نہ صرف فکری گہرائی رکھتے ہیں بلکہ انسانی زندگی کے مسلسل عمل اور جدوجہد کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہیں:

فُرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صُبح
چشمِ شفَق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لیے
رازِ حیات پُوچھ لے خِضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ نا تمام سے

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۲۸۸)

اقبال ایک معروف تلمیح،یعنی خضرِ راہ کے استعارے کو استعمال کرتے ہوئے زندگی کی حقیقت کو مزید واضح کرتے ہیں۔ خضر کو رہنمائی اور حیاتِ جاوداں کی علامت سمجھا جاتا ہے،اس لیے ان کا ذکر انسانی زندگی کے راز اور اس کی مسلسل جدوجہد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اس تلمیح کے ذریعے شاعر یہ پیغام دیتے ہیں کہ زندگی کا اصل راز کسی حتمی منزل تک پہنچنے میں نہیں بلکہ مسلسل کوشش اور عمل میں پوشیدہ ہے۔

تحقیق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظم ''خضرِ راہ'' میں اقبال نے زندگی کو ایک مسلسل عمل،جدوجہد اور تکمیل کی جستجو کے طور پر پیش کیا ہے۔ان کے نزدیک زندگی کا حسن اور اس کی اصل معنویت اسی بات میں ہے کہ انسان اپنی اندرونی صلاحیتوں کو مسلسل استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہے،کیونکہ کوشش کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہی زندگی کی حقیقی روح ہے:

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پُوچھ
جُوئے شِیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھَٹ کے رہ جاتی ہے اک جُوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۲۸۸)

اقبال کی نظموں میں تصورِ تقدیر ایک فعال اور حرکی تصور کے طور پر سامنے آتا ہے، جس کے مطابق انسان کو عالمِ اصغر (Microcosm) قرار دیا گیا ہے، کیونکہ وہ اپنی داخلی صلاحیتوں اور معنوی امکانات کے اعتبار سے عالمِ اکبر (Macrocosm) کا جامع نمونہ ہے، جیسے کہ:

> "انسان کو عالم اصغر (Microcosm) کہا گیا ہے کیوں کہ وہ عالمِ اکبر کے مقابلے میں ایک حباب کی مانند ہے۔" (انصاری، ۱۹۷۷، ص۷۷)

اقبال کی شاعری میں تقدیر کو جامد اور غیر متحرک قوت کی بجائے ایک ایسی حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسان کے ارادے، جدوجہد اور تخلیقی عمل سے تشکیل پاتی ہے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی شیرازہ بندی کرے، اسے اپنے مقاصد، عزائم اور اعلیٰ آدرشوں کے ساتھ ہم آہنگ بنائے اور اپنی عملی کاوشوں کے ذریعے اپنی تقدیر کو سنوارے۔ اس تصور کے مطابق زندگی کے مسائل اور چیلنجز دراصل انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

یوں اقبال کے ہاں زندگی سے نبرد آزما ہونے کی یہی صلاحیت انسان کو محض ایک تودۂ خاک سے بلند کر کے ایک باوقار اور بااختیار ہستی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہی جدوجہد اور مسلسل عمل انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتا ہے جہاں وہ اپنی تقدیر کا معمار بن جاتا ہے اور اپنی شخصیت کو قوت، استحکام اور معنویت عطا کرتا ہے۔ اس طرح اقبال کی نظموں میں تصورِ تقدیر انسان کی خودی، آزادی اور عملِ مسلسل کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہے اور اسے ایک مثبت، تعمیری اور ارتقائی عمل کے طور پر پیش کرتا ہے:

خام ہے جب تک تو ہے مٹّی کا اک انبار تُو
پُختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تُو

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص۲۸۸)

اقبال کی نظموں میں، خصوصاً خضر کے کردار اور اس کی تعلیمات کے ذریعے، یہ واضح کیا گیا ہے کہ حقیقی تقدیر وہی ہے جو خدا کی ذات سے وابستہ ہو، جبکہ انسان اس کے اندر جواب دہ اور بااختیار کردار ادا کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک تقدیر کوئی جبری نظام نہیں بلکہ انسانی ارادہ، خودی کی بیداری اور اخلاقی قوت کے ساتھ مربوط ایک عملی حقیقت ہے، جس میں خدمتِ خلق، عدل اور معاشرتی ذمہ داری تقدیر کے عملی اظہار کی صورتیں بنتی ہیں۔ معاصر سیاسی اور سماجی فکر کے تناظر میں اقبال کا فلسفۂ تقدیر اخلاقی خود مختاری اور عملی ذمہ داری کی بنیاد فراہم کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان کو اپنی تقدیر کا معمار بھی قرار دیتے ہیں مگر حقیقی حاکمیت کا سرچشمہ صرف خدا کو سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ ایسے سیاسی نظاموں، خصوصاً مغربی جمہوریت، پر تنقید کرتے ہیں جہاں اقتدار محض ظاہری آزادی کا تاثر دیتا ہے مگر عملی طور پر استحصال اور ناانصافی کو جنم دے سکتا ہے۔ اس طرح اقبال کے نزدیک تقدیر کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی کوشش اور عمل سے اپنی اجتماعی زندگی کو بہتر بنائے، لیکن اقتدار کو امانت سمجھتے ہوئے اسے عدل، دیانت اور انسانی فلاح کے لیے استعمال کرے:

ہے وہی سازِ کُہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(اقبال،۲۰۱۸ء، ص۲۹۰)

اقبال کے فکری نظام میں تصورِ تقدیر ایک متحرک اور بامقصد حقیقت کے طور پر سامنے آتا ہے، جو انسان اور اقوام کو بے بسی اور جمود سے نکال کر شعور، خود اعتمادی اور اجتماعی جدوجہد کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کے نزدیک مزدور یا قوم کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنی محرومی کو مقدر سمجھنے کے بجائے اسے بدلنے کی صلاحیت پر یقین رکھے اور اپنی تقدیر کی تشکیل میں فعال کردار ادا کرے۔ اسی لیے خضر کا پیغام شکست اور مایوسی کے بجائے امید،

بیداری اور نئے امکانات کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جہاں قومیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر تاریخ کا رخ بدل سکتی ہیں۔ اقبال کی نظموں میں مختلف استعارے اور منظر نگاری جیسے ''آفتابِ تازہ'' یا زنجیروں کا ٹوٹنا—ایک نئے دور، آزادی اور تجدیدِ حیات کی علامت بنتے ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں تقدیر کوئی جامد فیصلہ نہیں بلکہ ایک ارتقائی عمل ہے جو تاریخی شعور، فکری بیداری اور عملی اقدام کے ذریعے نئی صورت اختیار کرتا ہے، اور انسان و اقوام کو مایوسی کے بجائے حرکت، جدوجہد اور تعمیرِ مستقبل کی طرف رہنمائی دیتا ہے۔

ہمّتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غُنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نغمۂ بیداری جمہور ہے سامانِ عیش
قصّۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہُوا
آسماں! ڈُوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۲۹۲)

فکری اور سماجی تصور میں تقدیر کو انسانی خود اختیاری اور تخلیقی عمل سے وابستہ کیا گیا ہے، جس کے مطابق خضر کا پیغام مزدور اور عام انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ اپنی حالت کو مقدر سمجھ کر قبول نہ کرے بلکہ اپنی قوتِ عمل اور اجتماعی جدوجہد سے نئی تقدیر تشکیل دے۔ اقبال کے نزدیک تقدیر کوئی جبری حقیقت نہیں بلکہ انسانی شعور، امید اور مسلسل کوشش سے وابستہ ایک متحرک قوت ہے۔ اقبال کی شاعری میں ''آفتابِ تازہ'' اور ''کرمکِ ناداں'' جیسے استعارے اس بات کی علامت ہیں کہ انسان کو ذہنی غلامی سے نکل کر اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہیے اور عارضی تدابیر کے بجائے بنیادی تبدیلی کی طرف بڑھنا چاہیے۔ اس طرح اقبال تقدیر کو جمود کے بجائے آزادی، خود آگاہی اور مسلسل جدوجہد کا نام دیتے ہیں، جو انسان کو اپنی حالت بدلنے کی صلاحیت پر یقین دلاتا ہے:

کرمکِ ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۲۹۳)

اقبال کے ہاں وجودِ ملی کے ملبے کو محض تباہی کی علامت نہیں بلکہ ایک تعمیراتی امکان (Constructive Possibility) سمجھا جا سکتا ہے، جس پر مستقبل کی نئی تہذیبی اور اجتماعی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ اس طرح اقبال کا تصورِ تقدیر ایک متحرک اور ارتقائی عمل کے طور پر سامنے آتا ہے، جس میں زوال کے اندر ہی عروج کے بیج پوشیدہ ہوتے ہیں اور بحران نئی تاریخ کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق تاریخ کے نشیب و فراز دراصل ارتقا کے مراحل ہیں، جہاں پرانی ساختوں سے نئی قوتوں کے ظہور کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ یوں انتشار اور بحران کی موجودہ صورت حال کو ایک تخلیقی موقع (Creative Opportunity) کے طور پر تعبیر کیا جا سکتا ہے، جس کے ذریعے ملت اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک نئی اجتماعی تقدیر کی تشکیل کر سکتی ہے:

ربط و ضبطِ مِلّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۲۹۴)

اقبال کے پیغام کا مرکز و محور دو عناصر پر مشتمل ہے، جو ان کی نظموں میں تصورِ تقدیر کے عملی اور اجتماعی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔

اول یہ کہ مسلمان ہر طرح کے قومی، نسلی اور لسانی تعصبات سے کنارہ کش ہو کر ایک واحد، منظم اور مستحکم امتِ مسلمہ کا فعال جزو بنیں۔ اقبال کے نزدیک تقدیر کی تشکیل میں اس اتحاد کی بنیادی اہمیت ہے، کیونکہ اجتماعی بیداری اور ایک مشترکہ فکری و عملی ڈھانچہ ہی ملت کی تقدیر کو نئے امکانات کی جانب لے جا سکتا ہے۔

دوسرا عنصر اقبال کی نظموں میں دین کو وطن، ذات پات اور نسلی حد بندیوں پر ترجیح دینے کی پالیسی کے ذریعے واضح ہوتا ہے۔ ان کے نظریہ تقدیر کے مطابق فرد اور ملت کی نجات کا مؤثر ترین وسیلہ یہی ہے کہ وہ اپنی فکر و عمل میں اصولِ دین کی بالادستی کو تسلیم کریں۔ اس سوچ میں فرد کی خودی اور اجتماعی شعور دونوں کا ایک ساتھ احیاء ہوتا ہے، اور انسان اپنی تقدیر کی تخلیق میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔

اقبال کے ہاں صرف اخلاقی یا جذباتی بیداری نہیں بلکہ عملی اور اجتماعی فکری اصلاح کا عنصر بھی شامل ہے۔ یوں ان کی نظمیں فرد کی خودی کی بحالی اور ملت کی اجتماعی تقدیر کی تشکیل کے درمیان پل کا کردار ادا کرتی ہیں، جہاں تقدیر کو ایک متحرک اور تخلیقی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، نہ کہ محض مکتوب یا جبری واقعہ کے طور پر:

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
مُلک و دولت ہے فقط حِفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نِیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
تا خلافت کی بِنا دُنیا میں ہو پھر اُستوار
لا کہیں سے ڈھُونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص۲۹۵)

اقبال کی نظموں میں تقدیر کوئی جامد یا جبری حقیقت نہیں بلکہ ایک متحرک اور تخلیقی عمل ہے، جس میں فرد کی آزادی، خودی اور اجتماعی بیداری کے امتزاج سے امت مسلمہ اپنی نئی تقدیر تشکیل دے سکتی ہے اور زندگی کے اندر پوشیدہ تجدید اور حیاتِ نو کے امکانات کو عملی صورت دے سکتی ہے:

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر، دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردُوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رُسوائی تدبیر دیکھ

(اقبال،۲۰۱۸ء،ص۲۹۵)

تقدیر کا تصور محض نصیب یا جبری واقعات تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک تخلیقی اور شعوری عمل کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اقبال نے "اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان" کے شعر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ انسانی وجود اور دنیا کی تخلیق مسلسل عمل و کوشش کے تابع ہے، اور حوادث و مشکلات بھی اسی تخلیقی عمل کے ضروری مراحل ہیں۔

فرد اور ملت کی تقدیر (اجتماعی شعور کا اظہار):

اقبال کے نزدیک ادب کسی قوم کے اجتماعی شعور اور تہذیبی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور شاعر محض فنکار نہیں بلکہ قوم کا رہنما اور مصلح ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری کو جمالیاتی لطف تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے قوموں کی بیداری، تربیت اور تقدیر سازی کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ اقبال کے تصورِ ادب کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ تقدیر کوئی جامد قسمت نہیں بلکہ انسانی ارادے، خودی اور اجتماعی جدوجہد سے وابستہ ایک متحرک قوت ہے۔ ان کے ہاں فرد اور ملت کی تقدیر باہم مربوط ہے؛ فرد کی خودی کی بیداری ملت کی ترقی کا سبب بنتی ہے اور اجتماعی شعور قوموں کو زوال سے نکال کر عروج کی طرف لے جاتا ہے۔

فرد اور ملت کی تقدیر کا باہمی تعلق:

اقبال کی نظموں میں فرد اور ملت کی تقدیر کا تعلق باہمی انحصار پر قائم ہے، جہاں فرد کی اصلاح ملت کی ترقی کا سبب بنتی ہے اور ملت کا اتحاد فرد کو قوت اور شناخت فراہم کرتا ہے، یوں دونوں مل کر اجتماعی شعور کی بنیاد پر قوموں کی تقدیر کو تشکیل دیتے ہیں۔

اقبال کی فکر کا یہ انداز، جس میں عقیدۂ توحید و رسالت کو انسانی اور اجتماعی زندگی کی اساس قرار دیا گیا ہے اور جس میں فرد و ملت کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے فرد کی جگہ مسلم

اور ملت کی جگہ ملتِ اسلامیہ کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے، دراصل ان کے تصورِ تقدیر کے اجتماعی شعور کی ایک عملی تعبیر ہے۔ اقبال کے نزدیک فرد کی تقدیر تنہا اور الگ نہیں بلکہ ملت کی اجتماعی تقدیر کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح ملت کی تقدیر بھی افراد کے ایمان، عمل، خودی اور شعورِ مقصد سے تشکیل پاتی ہے۔ اس لیے اقبال کا یہ فکری نظام دراصل ایک ایسی مربوط وحدت پیش کرتا ہے جس میں فرد اور ملت دونوں ایک ہی تقدیری نظام کے دو پہلو ہیں۔

تاہم بعض ناقدین نے اقبال کے اس نظریے کو تنگ نظری، رجعت پسندی، تعصب اور فرقہ پرستی سے تعبیر کیا۔ ان کے خیال میں اقبال نے فرد اور ملت کی تقدیر کو صرف مسلمانوں تک محدود کر دیا ہے، جس سے ان کی فکر کی آفاقیت متاثر ہوتی ہے۔ بعض نے تو یہاں تک کہا کہ اقبال شاعر تو ہیں مگر ان کا فکری نظام عملی اور قابلِ اطلاق نہیں، جبکہ کچھ ناقدین نے ان کے پیغام کو محض ایک مذہبی حلقے تک محدود سمجھا۔ لیکن اگر اقبال کے پورے فکری اور شعری سرمایہ، خصوصاً ان کے تصورِ تقدیر کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ اعتراضات کمزور نظر آتے ہیں، کیونکہ اقبال کے ہاں فرد و ملت کی تقدیر کا تصور کسی نسلی یا جغرافیائی حد کا پابند نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور فکری اصول پر قائم ہے، جس میں اجتماعی شعور، خودی اور عمل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اقبال کے تصورِ تقدیر میں فرد اور ملت دونوں ایک دوسرے کی تکمیل ہیں، اور یہی باہمی ربط ان کی فکر کو ایک ہمہ گیر اور بامقصد فکری نظام بناتا ہے:

> ”پروفیسر آل احمد سرور نے ”اقبال اور اس کے نکتہ چین“ کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں، اقبال کے معترضین کو مدلل جواب دیے ہیں۔ شاہ معین الدین احمد نے بھی اقبال کے پیغام کی آفاقیت کی تائید میں ایک پر مغز مقالہ لکھا ہے، جگن ناتھ آزاد نے بھی اپنے مجموعہ مقالات میں، اس سلسلے میں نہایت کار آمد اشارے کیے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم نے اقبال پر تین اعتراضات کا جواب لکھ کر بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔“ (فتح پوری، ۲۰۱۴، ص ۱۱۳)

اگرچہ اسلام کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے اور ان کا اصل مخاطبہ بھی مسلم امت ہی ہے، لیکن اس کی وجہ کسی تنگ نظری یا تعصب سے زیادہ ایک عملی اور تاریخی ضرورت ہے۔ اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق فرد اور ملت کی تقدیر کسی مجرد یا خیالی تصور سے نہیں بنتی بلکہ وہ تاریخ کے زندہ حقائق، اجتماعی تجربات اور عملی مثالوں کے ذریعے تشکیل پاتی ہے۔ اس لیے جب کسی عالمگیر نظامِ حیات کو محض فلسفیانہ سطح پر پیش کیا جائے تو وہ ذہنوں کو متاثر تو کر سکتا ہے، مگر قوموں کی تقدیر کو بدلنے کی عملی قوت کم رکھتا ہے۔ اسی بنا پر اقبال نے اپنے نظریۂ تقدیر کو ایک زندہ اور قابلِ عمل صورت دینے کے لیے اسے فرد اور ملت کی حقیقی اجتماعی زندگی سے جوڑا ہے۔

اقبال کے نزدیک یہ ناگزیر تھا کہ فرد و جماعت اور خودی و بیخودی کے باہمی تعلق کو مجرد نظریے کی بجائے ایک عملی اور تاریخی قالب میں پیش کیا جائے، تاکہ قوم اپنی تقدیر کو سمجھ بھی سکے اور اس کی تشکیل بھی کر سکے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے مسلمان اور ملتِ اسلامیہ کو ایک عملی مثال کے طور پر منتخب کیا، کیونکہ ان کے نزدیک تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ملتِ اسلامیہ ایک ایسی اجتماعی اکائی ہے جس کی تقدیر نسب، نسل، وطنیت اور محدود قومی تعصبات سے بالاتر ہے۔ اس میں فرد کی تقدیر ملت کی تقدیر سے جڑی ہوئی ہے، اور ملت کی بقا فرد کے شعور، ایمان اور عمل پر منحصر ہے۔ اسی اجتماعی شعور کے ذریعے اقبال یہ دکھاتے ہیں کہ حقیقی تقدیر وہی ہے جو توحید کے اصول پر قائم ہو اور انسان کو ہر قسم کی بندگی سے آزاد کر کے ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام سے جوڑ دے، بقول اقبال:

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سِکھایا مجھ کو
وہ ابوالہول کہ ہے صاحبِ اَسرارِ قدیم
دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ اُمم
ہے وہ قوّت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دِگر گُوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے، کبھی چوبِ کلیمؑ!

(فتح پوری، ۲۰۱۴، ص ۴۵۶)

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر انھوں نے اپنے فلسفۂ حیات کو فرد اور ملت کی تقدیر کے باہمی ربط کے پیکر میں پیش کرنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ ان کا پیغام کسی ایک قوم یا ملت تک محدود نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہے، اور ان کی فکر کی اصل مخاطب ساری اقوامِ عالم ہیں، لیکن فرد اور ملت کی تقدیر کو واضح کرنے کے لیے انھوں نے ملتِ اسلامیہ کو ایک عملی اور تاریخی مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کی تقدیر ایسے اصولوں پر قائم ہے جو عالمگیر نوعیت رکھتے ہیں اور جن سے انسانی اجتماعیت کے بنیادی قوانین کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اقبال ایک انسان دوست مفکر اور شاعر کی حیثیت سے صرف ملتِ اسلامیہ ہی کے ہمدرد نہیں بلکہ پوری انسانیت کے بہی خواہ ہیں۔ ان کے نزدیک جس طرح ملتِ اسلامیہ کے زرّیں اصول پوری کائنات کے لیے مشعلِ راہ ہیں، اسی طرح ان کا فلسفۂ خودی بھی فرد اور ملت کی تقدیر کو سمجھنے اور سنوارنے کے لیے ایک ہمہ گیر رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ان کے فلسفے کی اساس مسلسل سعی اور عملِ پیہم پر ہے، اور یہی مسلسل سعی و عمل فرد کی تقدیر کو مضبوط کرتی ہے اور ملت کی اجتماعی تقدیر کو عروج کی طرف لے جاتی ہے۔ یوں اقبال کے ہاں فرد اور ملت دونوں کی تقدیر ایک ہی متحرک اور ارتقائی اصول کے تحت تشکیل پاتی ہے، جس کا مرکز عمل، خودی اور مقصدِ حیات کا شعور ہے۔

اقبال کے ابتدائی کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہیں کہ ان کے تصور میں فرد اور ملت کی تقدیر ابتدا ہی سے ایک ارتقائی اور ہمہ گیر اصول کے طور پر موجود تھی۔ اگرچہ ان کے ابتدائی دور کی نظموں ــــ جیسے "ہمالہ"، "نیا شوالہ" اور "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ــــ میں وسیع انسانی ہمدردی اور آفاقی اخوت کے آثار نمایاں ہیں، لیکن یہ اس امر کی نفی نہیں کرتے کہ بعد میں اقبال نے فرد اور ملت کی تقدیر کو ایک منظم فلسفیانہ نظام کی صورت دی۔ دراصل یہ ابتدائی تخلیقات اس بات کی علامت ہیں کہ اقبال کا فکری افق ابتدا ہی سے محدود نہیں تھا بلکہ وہ انسان اور اجتماع دونوں کی تقدیری معنویت کو سمجھنے کی طرف مائل تھے:

"ان کا تعلق اقبال کی شاعری کے اس دور سے ہے جب تو نہ اقبال نے اپنا فلسفہ خودی مرتب کیا تھا اور نہ ملت اسلامیہ سے والہانہ شیفتگی کے آثار، ان کے فکر و نظر میں نمایاں ہوئے تھے یہ بات واقعاتی حیثیت سے درست ہے لیکن یہ خیال کہ ملت اسلامیہ کو اپنے فلسفے کی اساس قرار دینے کے بعد اقبال اخذ و استفادہ، یا احترام آدمیت کے سلسلے میں کسی تنگ نظری یا تعصب کا شکار ہو گئے ہیں، درست نہ ہو گا۔" (فتح پوری، ۲۰۱۴، ص ۱۱۶)

بعد کے ادوار میں، خصوصاً اسرارِ خودی سے لے کر جاوید نامہ تک، اقبال کے ہاں فرد اور ملت کی تقدیر کا تصور ایک مکمل فکری نظام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس نظام میں فرد کی تقدیر اس کی خودی، ارادے اور مسلسل عمل سے وابستہ ہے، جبکہ ملت کی تقدیر اجتماعی شعور، اتحاد اور مقصدِ حیات سے تشکیل پاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ دونوں تقدیریں ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ ایک ہی ارتقائی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ان کے فکری ارتقاء میں یہ تسلسل واضح نظر آتا ہے کہ وہ ابتدا میں جس آفاقی انسان دوستی کی طرف مائل تھے، وہی بعد میں فرد اور ملت کی تقدیر کے ایک مربوط نظریے میں ڈھل گئی، جہاں ہر فرد اپنی خودی کو مضبوط بنا کر ملت کی اجتماعی تقدیر کو سنوارنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اقبال کے فکری نظام میں فرد اور ملت کی تقدیر کا تصور دراصل اجتماعی شعور (Collective Consciousness) کی ایک منظم اور ارتقائی تعبیر ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کی تقدیر کوئی جامد یا پہلے سے طے شدہ حقیقت نہیں بلکہ اس کے ارادے، عمل، اخلاقی شعور اور اجتماعی وابستگی کے نتیجے میں مسلسل تشکیل پاتی رہتی ہے۔ اسی طرح ملت کی تقدیر بھی محض سیاسی یا جغرافیائی وحدت نہیں بلکہ ایک زندہ اخلاقی و روحانی وجود ہے جو اپنے افراد کے شعور، کردار اور مقصدِ حیات سے پروان چڑھتا ہے۔ اس تناظر میں فرد اور ملت ایک دوسرے کے لیے علت و معلول کی حیثیت رکھتے ہیں، جہاں فرد کی داخلی تعمیر ملت کی اجتماعی تقدیر کو جنم دیتی ہے اور ملت کا اجتماعی شعور فرد کی شخصیت سازی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ تحقیقی اعتبار

سے اقبال کا یہ تصور قرآن کریم کے تاریخی شعور سے گہرا تعلق رکھتا ہے، جہاں اقوام کے عروج و زوال کو ان کے اجتماعی اعمال اور اخلاقی رویوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔ اقبال تاریخ کو محض واقعات کا تسلسل نہیں بلکہ اجتماعی شعور کے ارتقاء کا نام دیتے ہیں، جس میں فرد اپنی خودی کو مستحکم کر کے ملت کی تقدیر میں حصہ لیتا ہے۔ اس عمل میں فرد کا شعور جب اجتماعی شعور سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو ایک متحرک اور تخلیقی قوت پیدا ہوتی ہے جو قوموں کی تقدیر کو عروج کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب اجتماعی شعور منتشر ہو جائے تو ملت کی تقدیر زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ یوں اقبال کے نزدیک فرد اور ملت کی تقدیر دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، جن کی بنیاد عمل، خودی، مسلسل سعی اور مقصدِ حیات کا شعور ہے۔

تاریخ، قوم اور تقدیر کا رشتہ:

اقبال کے نزدیک تاریخ محض ماضی کے واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ کسی قوم کی اجتماعی زندگی، اس کی تقدیر اور اس کے عروج و زوال کا آئینہ ہوتی ہے۔ قومیں اپنی تاریخ کے ذریعے اپنی شناخت قائم کرتی ہیں اور اپنے مستقبل کی سمت متعین کرتی ہیں۔ تاریخ قوم کے تجربات، کامیابیوں اور ناکامیوں کو محفوظ رکھتی ہے اور یہی تجربات اس کی تقدیر سازی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تاریخ اور قوم کا رشتہ نہایت گہرا اور ناگزیر ہے، کیونکہ جو قوم اپنی تاریخ سے سبق حاصل کرتی ہے وہ اپنی تقدیر کو سنوارنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے۔

اقبال کی تاریخ میں تصورِ تقدیر:

اقبال کو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ، ان کی ملی زندگی کے مختلف دھاروں کے مد و جزر کی روداد، سیاساتِ اسلامیہ اور فکرِ اسلامی کے نشو و ارتقاء کی تاریخ سے جو گہری دلچسپی اور وابستگی تھی، اس کی بدولت ان کے ہاں تاریخ اور تقدیر کا ایک خاص تصور پیدا ہوا۔ اقبال کی نظم و نثر میں یہ اندازِ نظر اس قدر مربوط اور مسلسل ہے کہ اسے بجا طور پر ان کا تصورِ تاریخ و تقدیر کہا جا سکتا ہے، جہاں تاریخ کو قوموں کی تقدیر کے ظہور کا میدان سمجھا گیا ہے۔

اقبال کا نظریۂ تاریخ دراصل قرآنِ کریم کے تصورِ تقدیر کی تعبیر و تفسیر ہے۔ ان کے نزدیک تقدیر کوئی جامد اور غیر متغیر قوت نہیں بلکہ ایک ایسا زندہ اور متحرک نظام ہے جو قوموں کے اعمال، کردار اور اجتماعی شعور کے مطابق نتائج پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے وہ تاریخ کو استقرائی عمل کا سب سے بڑا ماخذ قرار دیتے ہیں، کیونکہ تاریخ کے واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کی تقدیر کن اسباب سے بنتی اور بگڑتی ہے۔ اسے اصطلاحاً تاریخی استقراء (Historical Induction) کہا جا سکتا ہے، یعنی ماضی کے حقائق کو ترتیب دے کر ان سے مستقبل کے نتائج اخذ کرنا۔

اقبال کے مطابق کائنات میں وقوع پذیر ہونے والی ہر حرکت تقدیر نہیں کہلاتی، بلکہ حقیقی تقدیر وہ ہے جو انسانی اعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا ارادہ اور عمل جب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں تو وہ اپنی تقدیر کو ایک اخلاقی اور باطنی معنی دیتے ہیں۔ اسی لیے اقبال تقدیر کو ایک اخلاقی قانون سمجھتے ہیں جو انسان کے کردار اور عمل سے وابستہ ہے۔ یہی ارادہ و عمل اقبال کے تصورِ تقدیر کو ان کے تصورِ خودی سے مربوط کرتے ہیں۔ جب فرد اپنی خودی کو مضبوط بناتا ہے اور اجتماعی زندگی میں مثبت کردار ادا کرتا ہے تو وہ نہ صرف اپنی بلکہ قوم کی تقدیر کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے۔ بعض اوقات قوموں کے باارادہ اور باعمل افراد تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں اور یوں تقدیر کے فیصلوں کو متاثر کر دیتے ہیں:

دنیا کے اُس شہنشہِ انجم سپاہ کو
حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل فام تھا
آج ایشیا میں اُس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اُسے پہچانتا نہیں

(اقبال، ۲۰۱۸ء، ص ۲۷۱)

اقبال کے نزدیک تاریخ کے عمل میں افراد و اقوام کی ذہنی زندگی کا جو تسلسل رونما ہوتا ہے، وہ دراصل تقدیر کی تدریجی تشکیل کا مظہر ہے۔ اگرچہ کوئی شخص فوری ارادے سے اپنی

تقدیر کو یکدم تبدیل نہیں کر سکتا، اس لیے تقدیر کے ظہور میں اسباب و علل کا ایک مسلسل سلسلہ کار فرما رہتا ہے۔ اس کے باوجود اقبال تقدیر کی پوشیدہ اور حیران کن قوتوں کو اصولاً تسلیم کرتے ہیں اور تقدیر کے شعور کو کسی قوم کی اجتماعی خودی کی بقا اور نشوونما کا ایک بہت بڑا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنی معروف تصنیف رموز بیخودی میں تاریخ کے حوالے سے اپنے نظریہ کی وضاحت کی ہے، جسے تقدیر کے مفہوم سے بھی بخوبی جوڑا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ صرف واقعات کا بیان نہیں بلکہ قوم کی تقدیر کے اسرار کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ کو ایک زندہ قوت تصور کرتے ہیں جو قوم کو اپنے ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان ربط قائم کرنے میں مدد دیتی ہے۔

اقبال کے نزدیک جب جذبۂ قومیت افراط کا شکار ہو جاتا ہے، یہ قوم کی تقدیر کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ اس صورت میں قوم اپنے وسیع تر انسانی اور اخلاقی مقاصد کو نظر انداز کر دیتی ہے اور محض اپنی برتری یا مفاد کے حصول کو مقصد بنا لیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فن، ادب اور ثقافت جیسے اعلیٰ انسانی شعبے تنگ نظری اور تعصب کی نذر ہو جاتے ہیں، اور قوم کی تخلیقی قوت کمزور پڑنے لگتی ہے۔ اس طرح قوم کی تقدیر زوال کی طرف مائل ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے اندر توازن، وسعتِ نظر اور اخلاقی بلندی باقی نہیں رہتی۔ اقبال کے تصورِ تقدیر میں اصل کامیابی اس بات میں ہے کہ قومیت کو ایک وسیلہ بنایا جائے، نہ کہ مقصدِ حیات۔ جب قومیت انسانی اخوت، عدل اور روحانیت کے اصولوں کے تابع رہتی ہے تو یہ قوم کی تقدیر کو روشن بناتی ہے اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن رکھتی ہے۔ اس طرح اقبال کے نزدیک متوازن قومیت تقدیر سازی کا ذریعہ ہے، جبکہ افراط زدہ قومیت تقدیر کے بگاڑ اور زوال کا سبب بن جاتی ہے:

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میّسر، تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسُور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

سبب کچھ اور ہے، تُو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہُوا
قلندری سے ہُوا ہے، تو نگری سے نہیں

(اقبال،۲۰۱۸ء، ص۵۳۲)

اقبال کے نزدیک قوموں کا عروج وزوال محض مادی وسائل یا دولت پر منحصر نہیں بلکہ اخلاقی قوت، خودی اور روحانی اقدار پر قائم ہوتا ہے۔ ان کے مطابق حقیقی طاقت فقر، خودداری اور بلند حوصلگی سے حاصل ہوتی ہے، جبکہ قوم کے زوال کی اصل وجہ غربت نہیں بلکہ کردار کی کمزوری اور مقصدِ حیات سے دوری ہوتی ہے۔ تقدیر کے پہلو سے اقبال یہ واضح کرتے ہیں کہ قوموں کی تقدیر ان کے ایمان، جرأت اور عمل سے بنتی ہے؛ جب قوم اپنی اخلاقی اور روحانی صفات کو زندہ رکھتی ہے تو اس کی تقدیر روشن رہتی ہے، اور جب وہ مادہ پرستی اور کم ہمتی کا شکار ہو جائے تو زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

تاریخ، قوم اور تقدیر کا رشتہ:

اقبال کے فکری نظام میں تاریخ اور قوم کی تقدیر کا رشتہ نہایت گہرا، نامیاتی اور باہم مربوط ہے۔ اقبال کے نزدیک تاریخ محض ماضی کے واقعات کا غیر جانبدار بیان نہیں بلکہ یہ اقوام کی اجتماعی زندگی، ان کے اخلاقی رویوں اور ان کے فکری و عملی رجحانات کا وہ تسلسل ہے جس کے ذریعے کسی قوم کی تقدیر کا تعین ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخ دراصل تقدیر کے ظہور کا ایک خارجی مظہر ہے، جبکہ تقدیر اس کے اندر کارفرما باطنی اصولوں کی نمائندہ ہے۔ اقبال کے ہاں یہ تصور قرآنِ کریم کے تاریخی شعور سے ماخوذ ہے، جہاں اقوام کے عروج و زوال کو ان کے اعمال، کردار اور اجتماعی رویوں سے منسلک کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں تاریخ ایک ایسے آئینے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں قومیں اپنی تقدیر کے اسباب و نتائج کو واضح طور پر دیکھ سکتی ہیں۔ تحقیقی اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال تاریخ کو ایک استقرائی (Inductive) عمل سمجھتے ہیں، جس کے

ذریعے ماضی کے تجربات سے عمومی قوانین اخذ کیے جاتے ہیں اور انھی قوانین کی روشنی میں قوموں کی تقدیر کو سمجھا جاتا ہے۔ اس تصور میں تقدیر کوئی جامد یا پہلے سے طے شدہ امر نہیں بلکہ ایک ارتقائی اور اخلاقی حقیقت ہے جو مسلسل انسانی اعمال سے تشکیل پاتی رہتی ہے۔ اس لیے جو قوم اپنی تاریخ سے سبق حاصل کرتی ہے وہ اپنی تقدیر کو بہتر سمت دے سکتی ہے، اور جو قوم اپنی تاریخی شعور سے محروم ہو جاتی ہے وہ رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ یوں تاریخ اور تقدیر ایک دوسرے کے لیے علت اور معلول کی حیثیت رکھتے ہیں؛ تاریخ تقدیر کے نتائج کو ظاہر کرتی ہے اور تقدیر تاریخ کے اندرونی محرکات کو واضح کرتی ہے۔ یہی رشتہ اقبال کے فلسفۂ حیات میں قوموں کی بقا، ارتقاء اور زوال کو سمجھنے کی کلید فراہم کرتا ہے۔

کتابیات

۱. احمد، ضیاالدین۔ (۲۰۰۱ء)۔ اقبال کا فن اور فلسفہ۔ لاہور: بزمِ اقبال۔

۲. اقبال، محمد۔ (۲۰۱۸ء)۔ کلیاتِ اقبال (اردو)۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

۳. انصاری، اسلوب احمد۔ (۱۹۷۷ء)۔ اقبال کی تیرہ نظمیں۔ لاہور: مجلس ترقی ادب۔

۴. حمید، شائستہ۔ (۲۰۱۴ء)۔ اقبال شناسائی۔ لاہور: نذیر سنز۔

۵. فتح پوری، فرمان۔ (۲۰۱۴ء)۔ اقبال سب کے لیے۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز۔

۶. نارنگ، گوپی چند۔ (۲۰۱۰ء)۔ اقبال کا فن۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔